تبصرۂ کتب

اقبال اور عصری مسائل، ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف۔ ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، صفحات ۵۶۸، قیمت۔/۷۵۰ روپے، مع اشاریہ، مجلد، مجلّاتی سائز۔

زیر تبصرہ کتاب متعدد حوالوں سے ایک قابلِ ذکر کتاب ہے۔ اس کا اولین حوالہ تو یہ ہے کہ اسے اقبال کے ایک نہایت قریبی معتمد اور محبّ چودھری محمد حسین [م: ۱۹۵۰ء] کی شاگرد نے لکھا ہے۔ تاہم کتاب کے مندرجات کو اگر استاد کی دانش کا پرتو سمجھا جائے تو اقبال کی مردم شناسی پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ افسوس (اور تعجب بھی) ہوتا ہے کہ اقبال نے ایسے پریشان فکر فرد کو اپنی اولاد کا سرپرست مقرر کیا تھا جو فکرِ اقبال کی موٹی موٹی چیزوں کو بھی نہ سمجھتا تھا۔ چودھری صاحب پر یہ الزام اس لیے لگانے کی جسارت کی جارہی ہے کہ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے اپنے فہم اقبال کو انھی کی جانب منسوب کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کو قائداعظم یونی ورسٹی اسلام آباد کی وائس چانسلر خاتون نے زندگی بھر کے مطالعے کے بعد لکھا ہے۔ فاضل مصنفہ کا پس منظر ترقی پسندی اور خود اختیاریت نسواں سے ایک گہری نسبت رکھتا ہے۔ یہ حوالہ تحریک نسواں کی ایک قائد کی دانش اور بصیرت کی پیمایش کا مصدر بنتا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں ترقی پسند دانش ور محمد حنیف رامے [م: یکم جنوری ۲۰۰۶ء] نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں: ''اقبال کے فکر و فلسفے کو پاکستان کی حقیقتوں کے ساتھ مطابقت دے کر مسلمانوں کے علم الکلام میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ (ص ۸)...... ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے کم و بیش تین سال اس کتاب پر صرف کر [دیے] اور انھوں نے یہ فرض نہایت دیانت داری سے ادا کیا...... [تاہم] یہ کتاب اقبال سے زیادہ پاکستان کے بارے میں ہے'' (ص ۷)___ رامے صاحب ایک وضع دار انسان تھے' انھوں نے رواداری میں تقریظ لکھی اور دو متضاد بیان دے کر کتاب کے حسن و قبح کی پیمایش کو قاری پر چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے اپنے منہاجِ تحریر کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ''میری یہ کتاب ایک کوشش ہے کہ اقبال کو اس کے افکار کے حوالے سے نہ پڑھا جائے، بلکہ یہ دیکھا جائے کہ اس [موجودہ]

دور میں اس کے فکری رجحانات کہاں تک ہماری مدد کر سکتے ہیں۔'' (ص ۱۱)ــــ معلوم نہیں اس بیان میں اقبال سے فیض حاصل کرنے کا راستہ دکھایا جا رہا ہے یا اقبال کو ایک فریم میں محض سجا کر اپنے مشاہدے اور اپنے افکار پر اقبال (بطور ایک خاموش تماشائی) کی مہر لگا کر پیش کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے؟ پوری کتاب میں چند مقامات پر ابتدا، درمیان میں اور پھر آخر میں کچھ اوراق پر اقبال کو چلتے چلتے محض بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ کتاب کا اسّی فی صد سے زیادہ حصہ مصنفہ کے فکری، نفسیاتی، داخلی اور ہیجانی افکار کی ایسی کشمکش کا آئینہ دار ہے، جس سے مصنفہ کے جذباتی اور قنوطی اسلوب بیان کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے، مگر پڑھنے والا اس مطالعاتی کرب و بلا سے کوئی راہ مستقیم تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اور آخر میں وہ سوال کرتا ہے:

''مسائل کا دکھ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ میں ان مصائب سے گزر رہا ہوں، لیکن میں نے اقبال کے دردِ دانش پر دستک دے کر اس کتاب کی طفیل رہنمائی چاہی تھی، افسوس کہ وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ اقبال ہمارے عصر سے غیر متعلق ہے؟ متعلق ہوتا تو یقیناً اقبال ضرور رہنمائی دیتا۔'' مگر یہ کتاب اتنے بڑے دعوے کے ساتھ اقبال اور فکر اقبال کو گم کر دیتی ہے۔ اس تناظر میں یہ کتاب کی دانش اور بصیرت کو مظلومیت اور بے زبانی کے دفتر میں دھکیل دیتی ہے۔

کتاب کے مندرجات کو دیکھیں تو بعض مقامات پر بڑے مضبوط دانش ورانہ جملے نظر نواز ہوتے ہیں، لیکن ایسے مرحلے بڑی مشکل سے آتے ہیں۔ یہ کتاب درحقیقت اقبال کا نام بروزنِ بیت استعمال کرتے ہوئے، مصنفہ کے ذوقِ مطالعۂ تواریخ کے نوٹس کا مجموعہ ہے۔ یہ نکات بھی کسی باقاعدہ ربط و تدوین کے بجائے رواں رواں انداز سے آگے پیچھے جوڑ دیے گئے ہیں۔

یہاں کتاب کے متعدد مقامات سے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے کتاب کے اندازِ فکر کو سمجھنا شاید آسان ہو جائے:

❁ ''اسلام میں راسخ الاعتقادی کا فلسفہ زور پکڑ گیا..... غزالی کی رجعت پسندی نے بہت عروج حاصل کیا..... منگولوں نے بغداد کو روند ڈالا تو مسلمان کے پاس اپنی شکست کا صرف ایک جواز تھا: چونکہ اسلام سے انحراف کیا تھا اس لیے ان پر یہ قہر نازل ہوا..... جیسے جیسے اسلام سے انحراف کا فتویٰ جڑ پکڑتا گیا، مسلمان ابہام پرست، قنوطی اور مثبت تبدیلی سے بھی گریز پسند بنتا چلا گیا۔'' (ص ۵۴-۵۵)ــــ غزالی، جس کی دانش کا ایک زمانہ معترف ہے، اس پر پانی پھیر دینے کے بعد مصنفہ نے مسلمانوں کی شام الم کا جس انداز سے تجزیہ پیش کیا ہے، یہ ملامتی طرزِ خطاب خود بہت سے سوالات کا سرعنوان ہے۔

❁ ''عربوں کی بے اعتنائی نے ترکی کو تو مذہب سے دور کرایا، یہاں تک [کہ] عربی میں اذان دینا

بھی ممنوع قرار پایا۔'' (ص ۸۰) ''مدتوں ترک، عثمانی خلافت کے نام سے عربوں پر حکمرانی کرتے رہے' لیکن چند واقعات پر ایسے بدظن ہوئے کہ عربی اذان سے توبہ کرلی۔'' ــــ مگر صرف ۳۵ سال بعد پھر عربی میں اذان دینا شروع کردی۔ آخر اتنا سطحی تجزیہ کس دانش وری کا مظہر ہے۔

❁ ''اسلام اتنا سادہ مذہب تھا کہ اس کی تشریح کے لیے پادریوں کی ضرورت نہ تھی۔'' (ص ۱۱۳-۱۱۴) ــــ مصنفہ نے علماے دین سے اپنی بے زاری اور نفرت کو یہاں لفظ ''پادری'' میں سمو کر تسکین حاصل کی ہے۔

❁ ''جب [جنرل] ایوب خان [م:۱۹/اپریل ۱۹۷۴ء] نے اقتدار پر قبضہ کرلیا تو اس غیرآئینی اور غیراخلاقی اقدام کو سہارا مذہبی تنظیموں اور عدلیہ نے دیا۔'' (ص ۱۴۳) ــــ یہاں پر روشن خیال مصنفہ کو بتانا چاہیے تھا کہ پاکستان کے اس سے پہلے خودساختہ فیلڈ مارشل کو کون سی مذہبی تنظیم نے سہارا دیا؟ اہل وطن آج تک ایسی مذہبی تنظیم کے نام سے بے خبر ہیں۔ انھیں متعین طور پر بتانا چاہیے تھا، روشن خیالی اور ترقی پسندی و سیکولر ذہنیت کے علم بردار جسٹس محمد منیر [م:۲۶/جون ۱۹۸۱ء] کی عدالت ہی نے ایوب خان کی آمریت کو سہارا دیا تھا، جس کا بعدازاں موصوف نے اعتراف بھی کیا لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے ابہام پرستی میں تاریخ کا قتل کرنے کے لیے یہ کیسا روشن خیال انداز اختیار کیا۔

❁ ''[پاکستان کے] تعلیمی اداروں میں دانش وری مغلوب و معتوب رہی، [اور] مُلّا، دانش ور کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔'' (ص ۱۴۴) ــــ یہ بتانا ضروری تھا کہ مشرقی پاکستان، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور پنجاب کی دانش گاہوں میں کہاں مُلّا نے یلغار کی؟ اور کتنے مُلّا یونی ورسٹی کے سیاہ وسفید کے مالک بنے؟ مصنفہ نے اپنی تحقیقی ذمہ داریوں کی ادایگی سے فرار کو ایک لفظ ''مُلّا'' میں سمو دیا ہے۔

❁ ''مغربی تہذیب کے علم برداروں نے اسلام اور اشتراکیت کو اکٹھا نہیں ہونے دیا۔'' (ص ۱۷۸) کیا خوب بقراطی نکتہ پیش کیا ہے!

❁ ''انگریز' ہندستانیوں کے مذاہب میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا، اسے ضرورت بھی نہ تھی''۔ (ص ۱۲۴) ــــ تاریخ کے طالب علم کے لیے اس خیال کا اُچھوتا پن، بیان سے باہر ہے۔ انگریزوں کی جانب سے یہاں مذاہب میں مداخلت کے حوالے سے متعدد ہمہ گیر اقدام اُٹھائے گئے۔

❁ ''دورِ حاضر میں اسلام کم علم ملاؤں کے قبضے میں آ گیا ہے۔'' (ص ۳۵)..... ''برطانوی دور میں ملائیت کو بہت فروغ ملا۔'' (ص ۱۲۶) ''مُلّا نے پڑھ رکھا ہے کہ اسلام محض عقائد کا نام نہیں' بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔'' (ص ۱۲۸) ''مُلّا، جہالت کے فروغ میں معاون ہے۔'' (ص ۱۲۹)۔ ''کیا رسول ﷺ کے دور کی سیاست وثقافت کے اصول وقوانین اس دور کی پیچیدہ سیاست وثقافت کے لیے موزوں ہوسکتے

ہیں؟'' (ص ۱۱۷) ''مُلّا اور غنڈا پارلیمنٹ میں پہنچ گئے''۔ (ص ۱۴۳)ــــ ''مُلّا'' اور مولوی سے اُکتاہٹ بلکہ نفرت کچھ اس انداز سے کتاب میں جھلکتی ہے کہ شاید اس کتاب کا اصل ہدف ''مُلّا'' ہے کہ وہی ان تمام قومی ناکامیوں کا ذمہ دار ہے۔ حالانکہ ان ہوش رُبا ناکامیوں کا آغاز بھی جدید تعلیم یافتہ ہاتھوں سے ہوا اور جن کی انتہا کا پھل بھی انھی جدیدیت پسندوں کے دامن میں آیا ہے لیکن اصل مجرم کو بچانے کے لیے مولوی دھر لیا گیا ہے۔

❁ ''مولانا جمال الدین افغانی [م: ۱۸۹۷ء] اتحادِ اسلام کے فلسفے کے موجد تھے..... وہ سرسیّد [م:۱۸۹۸ء] کو ہندستان میں اپنی جدوجہد کی مخالفت کا سب سے بڑا مہرہ سمجھتے تھے۔ ان کو سرسیّد کے عقلی اسلوب بھی کسی طور پسند نہ تھے۔'' (ص ۲۰۸)۔ ''دیوبندی علما بھی افغانی کے پیروکار ہوگئے۔ اس طرح قدامت پسند علما میں افغانی افکار کی مقبولیت بڑھ گئی۔ علی گڑھ کے مقابلے میں .....سب نے مل کر سرسیّد کی جدیدیت کو مغلوب کرلیا۔ ایک ترقی پسند علمی اور فنی تحریک جلد ہی رجعت پسند تحریک میں دب کر اپنی اصلی ارتقائی منازل سے منحرف ہوگئی۔'' (ص ۲۰۸-۲۰۹) ''جمال الدین کی شخصیت اتنی مؤثر اور مسحور کن تھی کہ باوجود ملک ملک کے بھٹکنے کے، ہرجگہ وہ مسلمانوں کا شعور بیدار کرنے میں کامیاب رہے۔ سرسیّد بھی افغانی سے متاثر ہوئے، شاہ ولی اللہ [م:۱۷۶۳ء] بھی اور اقبال بھی۔'' (ص ۵۲۲)ــــ زیرنظر کتاب کے صفحات پر شاہ ولی اللہ، افغانی، سرسیّد اور اقبال سبھی اپنی مظلومیت پر شکوہ کناں ہیں۔ اقتباسات میں تضادفکری پر مزید کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ لیکن افغانی سے ایک سوسال پہلے فوت ہوجانے والے شاہ ولی اللہ صاحب کا سوسال بعد آنے والے جمال الدین افغانی سے متاثر ہونے کا واقعہ جدیدیت، تحقیق کاری اور خردمندی کی ''بہترین'' مثال ہے۔

❁ یہ درست نہیں کہ ''اخوان المسلمون ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئی'' (ص ۴۳۳)ــــ اخوان المسلمون ۱۹۲۸ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس طرح نظم ''جواب شکوہ'' ۱۹۱۴ء نہیں (ص ۲۱۸) ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ علامہ کے انگریزی خطبات چھ نہیں (ص ۳۶) سات ہیں اور ان کا (نذیر نیازی کا) اُردو ترجمہ، اقبال اکادمی (ص ۳۶) نے نہیں بزم اقبال لاہور نے شائع کیا تھا اور ۱۹۵۷ء میں نہیں، ۱۹۵۸ء میں۔

❁ ''۱۹۷۴ء میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا شوشا پھر سے شروع کیا گیا۔ اس جھگڑے میں بھٹو [م:۴/اپریل ۱۹۷۹ء] نے شکست کھائی..... اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار [م:۲۷/جون ۲۰۰۳ء] نے مشورہ دیا کہ مرزا بشیرالدین محمود [م:۷/نومبر ۱۹۶۵ء] کو جو اس وقت جماعت احمدیہ کے سربراہ تھے، بلاکر پارلیمنٹ میں پوچھا جائے کہ وہ اپنی جماعت کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ جواب ملا کہ احمدی فرقے کے لوگ مرزا غلام احمد [م:۲۶/مئی ۱۹۰۸ء] پر ایمان نہ لانے والوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے' اس جواب کے بعد

پارلیمنٹ کے متفقہ اصرار پر احمدیوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا۔'' (ص ۳۵۸ تا ۳۵۹)ــــ اگرچہ اس سارے مسئلے کو بھی مصنفہ نے مولویوں یا مولویوں کے ''تنگ نظری'' پر مبنی رویے کے کھاتے میں ڈال کر قصہ تمام کیا ہے، لیکن وہ اپنا فتویٰ تصنیف کرتے ہوئے اقبال کی نہرو سے خط کتابت کو بھول گئی ہیں، جس میں اقبال نے لکھا تھا: ''احمدی، اسلام اور ہندستان دونوں کے غدار ہیں۔'' (اقبالنامہ، ص ۵۶۸)ــــ موصوفہ کے اقتباس میں دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ پارلیمنٹ میں مرزا ناصر الدین [م: ۹/جون ۱۹۸۲ء] آئے تھے، مرزا بشیر الدین محمود تو ۱۸ سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔

❁ ''۱۹۷۷ کے انتخابات [میں] پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور جمعیت علما اسلام نے پاکستان قومی اتحاد (PNA) بنا لیا۔'' (ص ۳۵۹)ــــ حالانکہ اس اتحاد میں ائر مارشل محمد اصغر خاں کی تحریک استقلال، نواب زادہ نصر اللہ خاں کی پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، مولانا شاہ احمد نورانی [م: ۱۱/دسمبر ۲۰۰۳ء] کی جمعیت علماے پاکستان، بیگم نسیم ولی خاں کی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل تھیں۔ لیکن دانستہ ان کا نام نظر انداز کیا گیا ہے تاکہ پاکستان قومی اتحاد کا ''رجعت پسندانہ'' چہرہ نمایاں کیا جا سکے۔

❁ ''۱۹۳۴ سے [محمد علی جناح] مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کی مندرج ذیل پارٹیاں تھیں: [۱۴ پارٹیوں کے نام درج ہیں] جمعیت العلمائے ہند، شیخ الہند محمود الحسن، ۱۹۴۰ سے مولانا حسین احمد مدنی [م: ۱۹۵۷ء]، جماعت اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودی''۔ (ص ۲۶۱، ۲۶۲)ــــ مولانا محمود حسن تو ۱۹۲۰ء میں انتقال کر گئے تھے، جب کہ جماعت اسلامی ۲۶/اگست ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ مصنفہ نے یہ ماضی و مستقبل کو ۱۹۳۴ء میں یک جا کر دیا، بلاشبہ وہ تاریخ پر گہری نظر رکھتی ہیں۔

❁ ''اقبال کو ہم نے ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ یا تو اسے رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے نواز کر اتنی عزت کی جائے کہ تنقیدی اور تجزیاتی حوالے سے پڑھنا ناممکن ہو جائے، یا اسے فلاسفر اور صوفی کہہ کر یہ ثابت کیا جائے کہ آج کے دور میں اس کی فکری اساس ہمارے لیے موزوں نہیں ہے۔'' (ص ۱۵۱)ــــ اقبال کو ان القاب و اعزازات سے تہی دست کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے شروع میں لکھا تھا: ''اس کتاب کے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نوجوان نسل، اقبال سے کچھ سیکھ سکے۔'' (ص ۱۶) ''[میں] طالب علموں کو بتانا چاہتی ہوں کہ تم کو اقبال کوئی نہیں پڑھائے گا۔ یہ کام تم کو خود کرنا ہوگا۔'' (ص ۱۸) ''اس کتاب کے لکھنے میں کوشش یہ بھی کی ہے کہ شاید ہم اقبال کے افکار کی مدد سے علما کی راسخ العقیدیت سے آزاد ہو سکیں۔'' (ص ۱۹)ــــ ظاہر ہے جب مقصد اتنا واضح ہو تو پھر تاریخ، افکار اور تہذیب کا وہی حشر کرنا ضروری ہو جاتا ہے، جو مصنفہ نے کیا ہے۔ اقبال کی راسخ العقیدیت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُن کی

عقیدت کا مرکز و محور نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ ہیں، اقبال کی رہنمائی کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، اسلامیت' اقبال کے نزدیک طرزِ حیات کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور مسلم امۃ کا اتحاد و فلاح اُن کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ''راسخ العقیدیت'' کی زنجیروں سے اقبال کو آزاد کرنے کے لیے لازم ہے کہ یہ تمام حوالے کلام اقبال سے نکال باہر کیے جائیں، مگر اس کے بعد بچے گا کیا؟ نائن الیون زدہ دانش کو اس سے کوئی غرض نہیں۔

کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے الجھاؤ کی تصویر ہے۔ اقبال کا حوالہ تو محض نام کا حوالہ ہی ہے، جس کا تعلق نہ متن سے ہے اور نہ حاشیے سے۔ اسے تاریخ کی کتاب بھی کہنا، مؤرخین کی اسکالرشپ سے زیادتی ہوگی۔ البتہ اسے روزمرہ صحافت کے ان افکارِ پریشان کا ایک ایسا پلندہ سمجھا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا، جنھیں ڈیسک پر بیٹھے صحافی حضرات بالکل وقتی ضرورت سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ایسی تحریروں کی زندگی ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔

❁ 'ڈاکٹر کے کے عزیز، مصنفہ کے فکری قبیلے کے ساتھی ہونے کے باوجود، تین چار مقامات پر بے وجہ: نفرت، رقابت اور محاسبے کا شکار ہوئے ہیں۔

اگر مصنفہ اس کتاب کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کر کے شائع کرتیں تو زیادہ مؤثر کاوش سامنے آتی۔ وہ تین حصے یہ بنتے ہیں: ۱-''اقبال جسے یوں ہونا چاہیے تھا'' ۲-''پاکستانی تاریخ' میری نظر میں'' ۳-'میرے مطالعۂ زندگی کا حاصل''ــــ کتاب کا اشاریہ بھی اسے کچھ نہ کچھ سہارا دے سکتا تھا۔ طرزِ بیان کی ناہمواری اور اکثر مقامات پر کھردارپن بھی کسی اُستاد کی چشم فیض سے روشنی پاتا تو نیک نام پبلشر اور 'روشن خیال' مکتب فکر کا کچھ بھلا ہوتا۔ ــــ سلیم منصور خالد

☆☆☆

اقبالیات کی وضاحتی کتابیات (تحقیق)، ڈاکٹر مشتاق احمد۔ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ وکیل سٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶، ۲۰۰۶ء، صفحات ۱۷۶، قیمت ۱۵۰/روپے۔

بھارت میں جامعاتی سطح پر تحقیق اقبالیات کا آغاز غالباً ڈاکٹر آصف جاہ کامرانی کے تحقیقی مقالے اقبال کا فلسفۂ خودی: اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (الٰہ آباد یونی ورسٹی، ۱۹۵۷ء) سے ہوتا ہے۔ [ابتدا میں ''ہندستان دشمن'' شاعر اقبال پر کام کی اجازت بہت مشکل سے ملتی تھی، مثلاً: عبدالحق کو شروع شروع میں گورکھ پور یونی ورسٹی سے اقبال پر مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی بعد ازاں، بدنامی کے خوف سے اور ازراہِ مصلحت بھی اجازت دے دی گئی۔]

بھارت کی جامعات میں اقبالیات پر تاحال کم و بیش پانچ درجن سندی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔

پیش نظر مقالہ اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔ ''پیش لفظ'' میں ڈاکٹر مشتاق احمد اپنے اس کام کو اقبالیات میں منفرد قرار دیتے ہیں۔ [''اقبالیات میں یہ ایک منفرد کام ہے۔''] یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ ہاں، کہنا چاہیے کہ بھارت کی حد تک اس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ بھارت میں پی ایچ ڈی کے لیے تحریر شدہ زیادہ تر مقالات کی نوعیت تشریحی و توضیحی اور تنقیدی ہے۔ یہ مقالہ حوالہ جاتی ہے۔ اقبالیاتِ بھارت میں حوالہ جاتی کاموں کی طرف کم ہی توجہ دی گئی ہے۔ اس کا ایک سبب وہ مشکلات بھی ہوسکتی ہیں جو کتابیات نگار کو بالعموم اس راہِ پُرخار میں پیش آتی ہیں اور شاید پتّا ماری کا وہ خوف بھی جو اس نوعیت کی تحقیق میں ہاتھ ڈالتے ہوئے لاحق ہوجاتا ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے اور ان کے باہمت و حوصلہ مند ہونے کی دلیل ہے۔

باب اول (اردو میں وضاحتی کتابیات) میں وضاحتی کتابیات کی نوعیت، اقسام اور ہیئت پر بحث کی گئی ہے اور اس کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے اُردو کی متعدد کتابیات اور اشاریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اردو کتابیات کی جتنی تعداد گنوائی ہے، اس کے پیش نظر یہ کہنا کہ: اب تک اُردو میں جتنا کچھ کام ہوا ہے اُسے انگلیوں میں گنا جاسکتا ہے۔ (ص ۲۶) اس کام کی تفصیل سے ناواقفیت اور اس کی اہمیت کو گھٹانے کے مترادف ہے۔ بیسیوں شخصی اور موضوعاتی کتابیاتوں کے علاوہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کا سلسلۂ ''سوانح و کتابیات'' کم و بیش، ایک سو مشاہیر ادب کا احاطہ کرتا ہے۔

دوسرا باب (اقبالیاتی ادب کا جائزہ) کتاب کے اصل موضوع (وضاحتی کتابیات) سے مختلف بلکہ منحرف ہے۔ ''جائزہ'' تبصرے اور تجزیہ و تحلیل اور کسی حد تک نقد و انتقاد کے مترادف ہے، جب کہ ''کتابیات'' صرف کتابیاتی کوائف (ناشر، صفحات، تقطیع، اور سنہ اشاعت) پر مشتمل ہوتی ہے۔ ''وضاحتی کتابیات'' میں کتابیاتی کوائف کے ساتھ، کتاب کے مباحث و مشمولات اور موضوعات و نوعیت سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب کا یہ جائزہ، کتابیات سے ایک الگ نوعیت کے محاکے کی نوعیت رکھتا ہے۔ ''آغاز تا ۲۰۰۰ء'' سے جائزے کی حد بندی کی گئی ہے یعنی ایک سو سالہ اقبالیات کا جائزہ ۲۲ صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک اچھی اور معلومات افزا کاوش نظر آتی ہے، تاہم جائزہ نگار کے بعض بیانات محلِ نظر ہیں، مثلاً لکھتے ہیں: ''اردو میں غالب کو چھوڑ کر شاید ہی کسی اور ادبی شخصیت پر اتنا کام ہوا ہوگا۔'' (ص ۲۸)ــــ اول تو یہ کہ ''غالب کو چھوڑ کر'' کیوں؟ باوجودیکہ مرزا غالب کی وفات پر سوا سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا اور اقبال کی وفات پر ابھی ستر برس ہی ہوئے ہیںــــ ہماری ناقص معلومات کے مطابق، جتنا تحقیقی و تنقیدی کام علامہ اقبال پر ہوا ہے، اردو کے کسی اور ادیب اور شاعر (بشمول مرزا غالب) پر اتنا کام نہیں ہوا، نہ اتنی کتابیں اور رسالے (مراد ہے خاص نمبر) شائع ہوئے۔

تقریباً دو ہزار مطبوعات پر مشتمل اقبالیاتی ادب مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ موضوعاتی تقسیم یوں ہوسکتی ہے: علامہ اقبال کے متن پر کتابیں، تراجم، شرحیں، حوالہ جاتی کتابیں (اشاریہ، کتابیات، فہرستیں وغیرہ) سوانحی کتابیں، تحقیقی وتنقیدی کتابیں، منظوم کتابیں اور رسائل و جرائد کے اقبال نمبر وغیرہ۔ مشتاق صاحب نے اس سارے ذخیرے کا جائزہ، اُن کی نوعیت یا موضوع کے لحاظ سے نہیں، بلکہ زمانی لحاظ سے لیا ہے۔ اس میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن ثانوی مصادر پر تکیہ کرنے سے زیرِنظر جائزے میں متعدد کوتاہیاں اور غلطیاں در آئی ہیں، مثلاً: پیام اقبال، اقبال کی سوانح کے اعتبار سے ''کافی اہمیت کی حامل'' ہے۔ (ص۳۲) اختر اورینوی کی کتاب اقبال ایک ''بنیادی کتاب کی حیثیت'' رکھتی ہے۔ (ص۳۲) ''اسلم ملک کا ترتیب کردہ مجموعۂ مضامین مطالعاتِ اقبال (۱۹۶۹ء) ایک ''ایسا بحرِ زخار ہے، جس کی وسعت میں بہت ساری کتابیں سما سکتی ہیں۔'' (ص۳۶) روح مکاتیب اقبال ''اقبال کی خطوط نگاری کے متعلق ایک اہم کتاب ہے۔'' (ص۳۹) شعریاتِ اقبال میں ''تشبیہاتِ اقبال کو موضوع بنایا گیا ہے۔'' (ص۴۴) ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کے عرصے میں اقبال پر باضابطہ کتابیں زیادہ لکھی گئی ہیں اور مجموعۂ مضامین بس گنتی ہی کے منظرِعام پر آئے ہیں۔ (ص۴۸)ــــ یہ اور اس طرح کے بیانات اصلاح طلب اور نظرِثانی کے محتاج ہیں۔

مشتاق احمد صاحب نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی مے لالہ فام ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی [جاوید اقبال صاحب ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے گویا انھوں نے یہ کتاب شائع کی تو اس وقت وہ ۲۰ سال کے تھے۔] مشتاق صاحب نے تقسیمِ ہند سے ماقبل کی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے [گویا یہ کتابت کی غلطی نہیں]۔ مجنوں گورکھ پوری کی کتاب اقبال کا سنہ اشاعت ۱۹۴۸ء لکھا گیا ہے، حالانکہ کتاب پر اشاعت کا سال درج نہیں۔ اس کے سنہ اشاعت کو حتمی طور پر متعین کرنے کے لیے کوئی معتبر شہادت میسر نہیں۔

تیسرا باب (اقبال پر نامور مصنفوں کی کتابیں) دو سو چھے کتابوں، اُن کے مصنفین اور سنین اشاعت پر مشتمل فقط ایک فہرست کتب ہے۔ اسے نہ تو کتابیات قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اشاریہ، اور نہ یہ موضوعاتی فہرست ہی ہے۔ کتابوں یا مصنفین کی الف بائی ترتیب بھی قائم نہیں کی گئی۔ دراصل اسے سالِ اشاعت کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے (یہاں بھی مے لالہ فام کا سنہ اشاعت ۱۹۴۴ء ہے۔) جب مؤلف کہتے ہیں کہ اقبال پر کم وبیش دو ہزار کتابیں شائع ہوئی ہیں تو کم از کم اس کے نصف (ایک ہزار) کی فہرست تو دینی چاہیے تھی۔ اگر وہ کہیں کہ یہ صرف ''نامور مصنفین'' کی کتابیں ہیں، تو اول: سوال یہ ہے کہ ''نامور'' کا معیار کیا ہے؟ اختر حسین گیلانی، سیدہ اختر، اختر صدیقی، احسن شکوہ، شرافت اللہ یا قدسیہ سرفراز کو کس اعتبار سے ''نامور'' کہا جائے گا؟ پھر یہ کہ فی الواقع نامور مصنفین کی ساری کتابیں اس فہرست میں نہیں آسکیں۔

نامور مصنفین کی ۲۰۶ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہر کتاب کے کتابیاتی کوائف اور اس کی مختلف توضیح بھی پیش کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہی کتاب کا مرکزی اور سب سے اہم حصہ بنتا ہے۔ اگر چہ اس حصے میں بھی متعدد خامیاں یا غلطیاں موجود ہیں، اس کے باوجود یہ ایک مفید اور معلومات افزا کاوش ہے اور اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے راہ نما اور مفید و معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کے آخری (چوتھے) باب میں اقبال پر مضامین کے ۴۲ مجموعوں کی توضیحی کتابیات کی فہرست اور بعد ازاں اُن کی توضیحی کتابیات مرتب کی گئی ہے۔ اگر چہ ''مقاماتِ آہ وفغاں'' یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ (ص ۱۴۲، ص ۱۴۳ کی فہرست کتب کے شمار نمبر ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۳۵ اور ۳۶ کسی صورت بھی اقبال پر مضامین کے مجموعوں کے ذیل میں نہیں آتے، وغیرہ۔)

آخر میں یہ وضاحت ناگزیر ہے کہ ص ۵۹ پر حکمت اقبال، راقم آثم سے منسوب کی گئی ہے، جو درست نہیں۔ اس کے مصنف میرے (جزوی) ہم نام فاضلِ گرامی اور اقبال اکادمی پاکستان کراچی کے اولین ناظم ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے۔　　ـــــ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

☆☆☆

سرودِ سحر آفریں، غلام رسول ملک۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء، صفحات ۱۶۳، مجلد، قیمت۔/۱۵۰ روپے۔

گذشتہ صدی کے اکابرین میں سے جن شخصیات پر روز افزوں تنقیدی و تفہیمی کام تسلسل سے جاری ہے، ان میں اقبال سرفہرست ہیں۔ اقبال کی نظریاتی وابستگی کے پیش نظر بعض ناقدین، اقبال کے مستقبل کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال کے پیغام کی اساس کسی مادی و لادینی فکر پر نہیں، بلکہ آفاقی، عالم گیر اور ابدی پیغام پر استوار ہے۔ سرودِ سحر آفریں کے مصنف نے اقبال کی عظمت کو اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

مصنف کے خیال میں اقبال نیتاً اور عملاً ایک اسلامی مفکر اور اسلامی فن کار تھے، تاہم وہ اقبال کے خطبات اور ان کے ابتدائی کلام کے بارے میں کوئی تاویل پیش نہیں کرتے۔ مصنف نے اقبال کی وابستگی پر اعتراض کرنے والوں کو دانتے، ملٹن، سعدی، ورڈز ورتھ، ٹالسٹائی، ییٹس اور ٹیگور کا حوالہ دیا ہے، جب کہ اقبال کی تنگ نظری کی شکایت کرنے والوں کو ابلیس، ابوجہل، وشوامتر، نٹشے، نپولین، بائرن اور لینن کے بارے میں اقبال کا ہمدردانہ روّیہ یاد دِلایا ہے۔

کلیم الدین احمد اور ان کی قبیل کے دیگر ناقدین کی طرف سے طعن و تشنیع کا جواب دیتے ہوئے

مصنف نے شعر و ادب میں پیغام، خطاب اور بیان کے دِفاع میں مشرق و مغرب کے ناموروں کا ذِکر کیا ہے اور کلامِ اقبال سے متعدد مثالیں پیش کر کے لکھا ہے کہ اگر یہ شاعری نہیں تو پھر دُنیا کی شاعری کا بیش تر حصہ دریابُرد کرنا پڑے گا۔

کتاب تیرہ مضامین پر مشتمل ہے، جنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصے میں اقبال کی عظمت کے بنیادی عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے میں 'اقبال کی عظمت'، 'اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت'، 'اقبال اور ملتِ اسلامیہ کا احیاے نو' اور 'اقبال کا قرآنی اندازِ فکر' شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں مصنف نے 'اقبال اور شاہ ہمدان' اور 'اقبال اور ورڈز ورتھ' کے عنوان سے اپنے تقابلی مطالعے کا حاصل پیش کیا ہے، تیسرے حصے میں 'بزمِ انجم کے تعلق سے'، 'محاورہ مابین خدا و اِنسان'، 'بندگی نامہ' اور 'ذوق و شوق' میں عملی تنقید کا اظہار ہوا ہے، جب کہ چوتھے حصے میں 'اقبال کے پسندیدہ اصنافِ شعر'، 'بانگِ درا کی غزلیں' اور 'جاوید نامہ کی تکنیک' میں اقبال کے شعری فن کی بوقلمونی پر بحث کی گئی ہے۔

'اقبال کی عظمت کا راز' میں ان کی مختلف علمی و فکری حیثیات سے بحث کی گئی ہے، تاہم مصنف کے خیال میں جو خصوصیت انھیں زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا ثباتِ دوام عطا کرتی ہے وہ ان کا دَورِ حاضر کے آشوب کا صحیح عرفان اور اس مرض کی صحیح تشخیص ہے۔ اقبال کی نظر میں عصرِ حاضر کا اصل مسئلہ زندگی سے مذہب کی دوری ہے۔ مصنف نے مذہب سے لاتعلقی کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، چاہے وہ مذہب بے زار مادہ پرستی سے پیوستہ ہوں یا لادِین اشتراکیت سے۔ اسی لادینیت نے انسان میں خودغرضی، مفاد پرستی اور بددیانتی کو فروغ دیا اور انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی و بربادی کا سامان ہونے لگا، چنانچہ مصنف کے نزدیک زمانۂ حاضر کے مرض کی یہ بصیرت و فراست کی آئینہ دار تشخیص، یہ داعیانہ اندازِ فکر اور بے باکانہ لب و لہجہ، اس ازلی اور ابدی حقیقت کے ادراک پر مبنی ہے، جو کائناتِ ہستی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔

'اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت' میں مصنف نے اقبال کا یہ استدلال پیش کیا ہے کہ آج کا انسان شاہراہِ اعتدال سے ہٹ گیا ہے۔ اقبال مغرب کی مادی ترقی اور تسخیر کائنات کے بعد اس کی ہلاکت خیزیوں کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری جانب نری رُوحانیت کے باعث مشرق کی محکومیت کو بھی فراموش نہیں کرتے۔

مصنف کے خیال میں 'ملتِ اسلامیہ کا احیاے نو' ان چند موضوعات میں سے ہے، جن پر اقبال نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی۔ اقبال کی نظر میں قرونِ اولیٰ کا عروج بھی تھا اور حال کا زوال بھی۔ ان کے نزدیک زوال کی دو وجوہ تھیں..... ایک حیات کش اور رہبانی نظریات کی ترویج اور دوسری اجتہاد کا فقدان۔ مصنف نے تربیتِ فرد اور تعمیرِ ملت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ مومن نہ دُنیا پرست ہوتا

ہے اور نہ دنیا بے زار، بلکہ وہ دُنیا کو مسخر کرتے ہوئے اسے اپنے رُوحانی ارتقا کا ایک زینہ بنالیتا ہے۔

'اقبال کا قرآنی اندازِ فکر ونظر' میں مصنف نے مغربی فن کاروں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی بڑے تخلیقی فن کار کا کسی کتاب یا مصنف سے متاثر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ اقبال کے فکر ونظر پر قرآن کی گہری چھاپ ہے، جس کے نتیجے میں ان کے اشعار میں اکثر اوقات قرآنی لب و لہجے اور اسلوب و آہنگ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال کے اس دعوے میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں اسرارِ قرآن کے موتی پروئے ہیں اور ایک صدی سے زیادہ مدت پر محیط شبِ تاریک کو نورِ قرآن کے ذریعے سحر آشنا کیا ہے۔

کتاب کے دو مضامین مشرق و مغرب کی دو شخصیات سے اقبال کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہیں۔ کلامِ اقبال میں شاہ ہمدان جاوید نامہ میں ڈرامائی تناظر میں نمودار ہوتے ہیں، چنانچہ وہ تاریخ کے شاہ ہمدان کم اور اقبال کے شاہ ہمدان زیادہ دِکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کی شاعری میں تاریخی شخصیات ان معانی و مطالب کی ترجمان بن جاتی ہے، جن کا ان کے فلسفۂ حیات سے گہرا تعلق ہے، چناں چہ وہ ان شخصیات میں ضرورت کے مطابق رَد و بدل بھی روا رکھتے ہیں، تاکہ وہ ان کے فکر ونظر سے ہم آہنگ ہوسکیں۔

مشرقی رجحان داخلیت کا حامل رہا ہے اور مغرب کا غالب رجحان اس کی خارجیت اور معروضیت ہی قرار پاتا ہے، تاہم مغرب میں زیریں سطح پر داخلیت کی لہریں کبھی غیر محسوس طور پر اور کبھی کبھار ذرا نمایاں صورت میں نمودار ہوتی رہی ہیں۔ اقبال، جو مغرب کی بہت سی شخصیات اور ان کے فکر ونظر سے مفید مطلب نقطہ نظر سے مستفیض ہوتے رہے ہیں، یورپ کی رومانی تحریک اور بالخصوص اس کے نمایندے ورڈز ورتھ سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ 'اقبال اور ورڈز ورتھ' میں مصنف نے مغرب کی رومانی تحریک اور خاص طور پر ورڈز ورتھ سے اقبال کی گہری وابستگی کے اسباب جاننے کی کوشش کی ہے۔ فنِ شعر سے متعلق دونوں کے مشترک نظریات کو پیش کرنے کے بعد مصنف نے ایک اختلافی امر کا ذکر کیا ہے، جس کے مطابق جہاں اقبال کے نظریۂ فن میں جلال کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے، جو جمال کو ہے؛ وہاں ورڈز ورتھ کے نظریۂ فن میں اصل اہمیت جمال کی ہے۔

اقبال کے فکر ونظر پر گفتگو کے علاوہ غلام رسول ملک نے اقبال کی مختلف نظموں کے بارے میں عملی تنقید کے چار نمونے پیش کیے ہیں۔ مصنف کے مطابق ایک عظیم فن کار کی طرح اقبال کی فکر، ان کی شاعری کے تابع رہتی ہے، اس لیے اہم پیغامات کی حامل ان کی بیش تر منظومات عام طور پر ایک انتہائی دِل رُبا اور سحر انگیز حسن آفرینی سے شروع ہوتی ہیں، یہاں تک کہ قاری کے اندر اس حسن کے لیے ایک والہانہ جذبۂ

عشق پیدا ہو جاتا ہے اور پھر شاعر کی زبان سے حقائق و اَسرار کا انکشاف شروع ہو جاتا ہے۔ مصنف نے 'خضرراہ'، 'ذوق وشوق' اور 'ساقی نامہ' کو مثال کے طور پر پیش کرنے کے بعد 'بزمِ انجم' کا فکری جائزہ لیتے ہوئے اسے اقبال کی اُن منظومات میں شامل کیا ہے، جن میں شروع کی منظر کشی اور بعد کے کشفِ حقائق میں ایک نامیاتی رشتہ ہے۔

'محاورہ مابین خدا و اِنسان' پر بات کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری نہ صرف جمالیاتی تسکین کے ذریعے ہماری رُوح کو بیدار کرتی ہے، بلکہ اس بیداریِ رُوح اور قلبی زندگی کو ارتقاے حیاتِ انسانی کی راہ میں وقف کرنے کی تحریک بھی ہمارے اندر پیدا کرتی ہے۔

نظم کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ڈرامائی تکنیک اس زبردست ارتکاز کی اساس ہے، جو تخلیقی نقطہ نظر سے اس نظم کی اہم خصوصیت ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظم ایجاز و بلاغت کی بہترین مثال ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں جہانِ معنی نہیں، بلکہ جہان ہاے معنی سمیٹ لیے گئے ہیں۔

زبورِ عجم کی نظم 'بندگی نامہ' کو مصنف نے اقبال کی ان اہم ترین منظومات میں شمار کیا ہے، جن میں انھوں نے فن اور مذہب کے متعلق اپنے خیالات بہت ہی جامعیت اور اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ مصنف کے خیال میں اقبال مذہب اور آرٹ کو ایک ہی حقیقت کبریٰ کے مختلف پہلو تصور کرتے ہیں اور یہ کہ فن اور مذہب دونوں کا زندگی سے ایک بامعنی تعلق ہے اور ان کی قدر و قیمت کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ زندگی کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں۔

'ذوق وشوق' کو مصنف نے اقبال کا ارضِ فلسطین سے واپسی پر امتِ مسلمہ کے لیے ایک تحفہ سمجھتے ہوئے انھیں رومی، سعدی، عطار اور سنائی کا ساتھی قرار دیا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے اس نظم کو ترکیب بند کہا جا سکتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے نعتیہ قصیدہ، جو عربی قصیدے کی روایت سے متعلق ہے۔ نظم کا بھرپور موضوعی جائزہ لینے کے بعد مصنف نے اس کے اسلوب اور اس کے زیر اثر موسیقیت پر گفتگو کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عملی تنقید پر مشتمل مذکورہ چاروں مضامین کے مطالعے کے بعد قاری ان نظموں کی بہتر تفہیم کے قابل ہو جاتا ہے، جو درسی تشریحات کی سطحیت کے بجائے ذہنی افق کی وسعت پذیری کا سبب بنتی ہے۔

'اقبال کے پسندیدہ اصنافِ شعر'، 'بانگِ درا کی غزلیں' اور 'جاوید نامہ کی تکنیک' میں ملک صاحب نے اقبال کے ہاں ہیئتی اور تکنیکی تجربات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

مصنف کے مطابق اقبال مشرقی مزاج کے عین مطابق فی الاصل ایک تغزل پسند شاعر ہیں۔ مشرق کی تمام تر اصنافِ شعر، جو اپنے مقصد و موضوع کے اعتبار سے معروضیت کی حامل ہیں، ان میں بھی وہی اظہارِ جذبات، وہی وارداتِ قلب کا بیان اور وہی احساس کی آنچ میں تپتی ہوئی زبان ملتی ہے، جو فارسی

اور اردو غزل کا امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں غزل، رباعی، نعت اور مثنوی میں نئے تجربات کے باوجود روایت کی پاس داری کی گئی ہے۔

اپنی منظومات کے لیے انھوں نے ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس اور دیگر ہیئتوں کا استعمال کیا ہے۔ نظموں میں ان کی پسندیدہ صنف ترکیب بند ہے، جس کی ساخت مصنف کے خیال میں اقبال کی پیچیدہ شخصیت اور کثیر الاطراف فکر کے مختلف پہلو ابھارنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ معروضیت اور صلاحیتِ نفی ذات کے ثبوت کے باوجود اقبال کی ڈرامائی نظموں میں شخصی اور غنائی عنصر غالب ہے اور وہ ان کے بہترین شاہ کاروں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ 'خضرراہ'، 'جبریل وابلیس'، 'شعاعِ امید'، 'تنہائی'، 'محاورہ مابین خدا و اِنسان'، 'قطرۂ آب'، 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' اور جاوید نامہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے کہا ہے کہ اقبال چاہے، کسی بھی صنف کو برت رہے ہوں، ان کا شخصی لب ولہجہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

'بانگِ درا کی غزلیں' میں مصنف نے نہایت اختصار سے اقبال کے تینوں ادوار کی غزلوں کا جائزہ لیا ہے۔ اقبال کے ابتدائی دو ادوار میں ان کی غزل مضامین و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے روایت کی پاس داری کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جب کہ تیسرے حصے کی غزلیں نمایاں طور پر پہلے دونوں حصوں سے مختلف ہیں۔ مصنف کے خیال میں تیسرے حصے کی غزلوں میں اقبال کی شخصیت روایت پر غالب آ جاتی ہے اور یہاں ایسے اشعار بکثرت مل جاتے ہیں، جو بآسانی بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں جگہ پا سکتے ہیں۔

'جاوید نامہ کی تکنیک' میں مصنف نے قدیم معراج ناموں کی ہیئت کا جائزہ لیا ہے اور تخلیقی ادب میں تکنیک کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک عظیم فن پارہ اس وقت وجود میں آتا ہے، جب تکنیک موضوع کے عین مطابق ہو اور موضوع تکنیک کے سانچے میں بآسانی ڈھل جائے۔

لہجے کے دھیمے پن اور شگفتہ اندازِ نقد کی بِنا پر غلام رسول ملک کی یہ کاوِش مجموعی طور پر اقبالیات میں ایک نہایت وقیع اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک طرف اقبال کی نظم و نثر کے کُل سرمائے کو پیش نظر رکھا ہے اور دوسری جانب اپنے مقالات کو مشرق و مغرب کے معروف و مستند حوالوں سے مزین کیا ہے۔ کتاب مصنف کی تنقیدی سنجیدگی اور علمی متانت کا بیّن ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے 'تقدیم' میں بجا طور پر مصنف کو ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جانے والے اقبالیین میں شمار کیا ہے۔

—— ڈاکٹر خالد ندیم

☆☆☆

اقبال اور عالم عربی، ڈاکٹر بدرالدین بٹ، ناشر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل سری نگر، ۲۰۰۷ء، صفحات ۲۱۴، قیمت ۱۵۰/- روپے۔

بلادِ عرب میں علامہ اقبال کے تعارف اور ان کی فکر کے اثرات کا دائرہ علامہ کی زندگی ہی میں قائم ہو گیا تھا اور آج تک مسلسل پھیل رہا ہے۔ اقبال اور عالم عربی میں اس دائرے کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ۲۱۴ صفحات پر محیط ۱۳ میں سے ۶ مقالات اقبال اور عالم عربی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دیگر مقالات کا موضوع سے بالواسطہ تعلق ہے۔ ترتیب میں اقبال اور عالم عرب سے متعلق مقالات کو اوّل رکھا گیا ہے، کتاب کا نام بھی انھی سے معنون ہے اور یہی کتاب کا اصل موضوع ہے۔

عنوان ''اقبال اور عالم عربی'' کے تحت بلادِ عرب میں اقبال کے تعارف کا سرسری ذکر کرنے کے بعد معروف مصری اقبال شناس پروفیسر حسین مجیب المصری کی کتاب اقبال والعالم العربی کی روشنی میں مصنف کے خیالات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

''مصر میں اقبالیات'' کے تحت عبداللہ عزام، شیخ صاوی شعلان، ام کلثوم، عباس محمود، محمد سعید جلال الدین، نجیب الکیلانی اور دیگر اہل قلم کے اقبال پر کام کا تعارف ہے۔

''ڈاکٹر احمد امین کے افکار پر اقبال کا اثر'' کے تحت احمد امین کی کتب یوم الاسلام اور فجرالاسلام کی روشنی میں یہ لکھا ہے کہ احمد امین نے اپنی تصنیفات میں اگرچہ اقبال کا نام نہیں لیا مگر بیشتر مقامات پر فکر اقبال سے استفادہ کیا ہے اور احمد امین کے افکار میں فکر اقبال کے اثرات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔

''کلام اقبال کے عربی تراجم اور شروح'' کے تحت ۱۷ کتب کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

''اقبال پر عربی تصنیفات کا ایک تعارف'' کے زیرعنوان حیات وفکرِ اقبال پر چھوٹی بڑی کم وبیش ۲۵ کتب اور مقالات کا تعارف ہے۔

''محمد اقبال: اساطین علم وادب اور زعماء دعوت وفکر کی نگاہ میں'' کے زیرعنوان ۱۵، اصحاب علم وفضل کی علامہ اقبال کے بارے میں آرا سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن میں بیشتر اہل علم کا تعلق عربی زبان وادب سے ہے۔

---

۲۱۴ صفحات کی کتاب میں قریباً ایک سو صفحات ''اقبال اور عالم عربی'' کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''اقبال اور عالم عربی'' ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس پر اب تک ۷۰ سے زاید کتب منظر عام پر

آ چکی ہیں جن میں سوانحی اور فکری دونوں طرح کا مواد موجود ہے۔ ان میں نظم ونثر اقبال کے تراجم وشروح بھی ہیں۔ اقبال اور عالم عربی کے مصنف عربی زبان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے اس پورے کام کا ایک مبسوط ومربوط تعارف اور جائزہ پیش کر سکتے تھے مگر شاید مواد کی کم دستیابی اور کما حقہ توجہ نہ دے سکنے کے باعث یہ تعارف اور جائزہ ایک سرسری نوعیت کا جائزہ بن کر رہ گیا۔ کتاب کے مقدمہ نگار پروفیسر بشیر احمد نحوی نے بجا لکھا ہے کہ ''اس موضوع پر کام کرنے کی ابھی کافی گنجائش موجود ہے اور آئندہ ہمارا ارادہ ہے کہ عربی زبان وادب سے اچھی واقفیت رکھنے والے کسی اسکالر سے اس موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرائیں گے۔ (ص ۶) یقیناً اس موضوع پر کام کے بھرپور تعارف کی ضرورت کا پورا ہونا ابھی باقی ہے اور اسے پوری توجہ، دقتِ نظر، عرق آمیزی اور وسعت نظر سے انجام دینے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر کام کی قابلِ تقلید طرح تو معروف اقبال شناس جناب رفیع الدین ہاشمی ڈال چکے ہیں لیکن اسے موضوع اور مقالے کی سطح سے تصنیف اور کتاب کے مقام تک لانے کی ضرورت ابھی مکمل طور پر موجود ہے۔ بہرحال اقبال اور عالم عربی کے ذریعے سے موضوع کی اہمیت کی طرف اشارہ ضرور ہو گیا ہے اور اس اشارے سے ہمت پا کر منزل پر پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' سری نگر سے شائع ہوئی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس قدر بے توجہی سے پیش کی گئی ہے کہ کتاب کے عنوان میں ہی یکسانیت نہیں، باہر کچھ، اور اندر کچھ اور ہے۔ مقالات کے اندر متن واقتباس کا فرق عیاں نہیں کیا گیا۔ حوالہ جات ادھورے اور ناقص دیے گئے ہیں۔ کوئی مروج اسلوب وانداز اختیار نہیں کیا گیا۔ پروف خوانی کے شدید نقص کی بنا پر کتاب کے اندر ایک اغلاط نامہ رکھ دیا گیا ہے اور وہ بھی اس نقص کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ آئندہ اشاعت میں اس کام کو مربوط، مستند اور جامع انداز میں پیش کیا جائے تو یہ اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ ہوگا۔

☆☆☆

ماہنامہ **سیارہ** (سال نامہ ۲۰۰۷ء)، حفیظ الرحمٰن احسن (مدیر مسئول)، کمرہ نمبر ۵، پہلی منزل، نور چیمبرز، بنگالی گلی، گنپت روڈ، لاہور، صفحات ۴۲۴، قیمت ۔/۲۰۰ روپے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی ہندوستان کے معروف اقبال شناس دانشور اور ادیب واستاد تھے۔ ماہنامہ سیارہ کی اس اشاعت میں ان کی یاد میں ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی اپنی تحریریں اور ان کے بارے میں چند اہل علم کے تاثرات وخیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ کم وبیش ۱۳۰ صفحات پر محیط ڈاکٹر عبدالمغنی کے بارے میں بیشتر تحریروں کا اصل موضوع اقبال اور فکر اقبال ہی ہے۔ لکھنے والوں میں حفیظ الرحمٰن احسن،

ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سید عبدالباری، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، معصوم عزیز کاظمی، سید احمد عروج قادری اور دیگر نام شامل ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کی ذاتی تحریریں تو ان کی تصانیف میں موجود ہیں اور ان پر تحقیق وتنقید بھی سامنے آ چکی ہے، البتہ تاثرات اور مکاتیب کے حوالے سے تحریریں نئی ہیں۔ پاکستان آمد پر ان سے کیے گئے مکالمات (اخبارات میں مطبوعہ) بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مکاتیب کا مجموعہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام ہے۔ سیارہ کی اس کاوش سے ایسی بہت سی چیزیں یکجا ہوگئی ہیں جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اقبالیات سے ہے۔ فکر ونظر اور نقد وتبصرہ پر مشتمل یہ تحریریں اقبال کے فکر وفن کے کئی گوشوں پر گفت وشنید اور غور وخوض کا محرک ثابت ہوسکتی ہیں۔ ــــــ ارشاد الرحمٰن